۱۵ر جنوری سنہ ۱۹۸۲ء

رجسٹرڈ نمبر L. 922
فون نمبر ــ 29

ایڈیٹر
آل احمد سرور

فی کاپی بیس پیسے
قیمت سالانہ ۷ روپے

اشاعت کی تاریخیں
۱ ، ۸ ، ۱۵ ، ۲۲

ہفتہ وار
ہماری زبان

جلد ۴۱ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۳

اداریہ

اردو کے لئے چند ضروری کام

اس وقت حکومت ہند اور بعض ریاستی حکومتیں اردو کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ اردو دوستوں کی جائز شکایات دور ہوں اور اردو کی ترقی کے لئے راہیں کھلیں۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیمات نے اس غرض سے ایک ورکنگ گروپ بنایا ہے۔ اترپردیش کی حکومت نے بھی اردو اکاڈمی کی تشکیل کردی ہے۔ حکومت ہند کا ترقی اردو بورڈ تو کچھ عرصے سے کام کر رہا ہے اور یونی ورسٹی کے معیار کے لئے مختلف علوم کی کتابیں اردو میں تیار کرا رہا ہے۔ آندھرا اور راجستھان میں حکومت نے ساہتیہ اکاڈمیاں قائم کی ہیں جن کے ذریعہ سے ریاستی زبانوں کے علاوہ اردو میں بھی کتابیں لکھوائی جاتی ہیں۔ امید ہے کہ اس طرح کے ادارے دوسری ریاستوں میں بھی قائم ہوں گے۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر ادارہ اپنا دائرۂ کار متعین کرے تاکہ کاموں کی تکرار نہ ہو اور روپیہ اور محنت برباد نہ ہو۔ دوسرے یہ بھی ضروری ہے کہ ترجیحات (PRIORITIES) قائم ہوں تاکہ پہلے اہم کام ہاتھ میں لئے جائیں اس کے بعد نسبتاً کم اہم کام۔ تیسرے اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ بنیادی مسئلہ زبان کی تعلیم کے لئے ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کا ہے اور یہ سہولت ابتدائی اور ثانوی دونوں منزلوں پر ملنی چاہئے۔ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے اصول کو تو تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس پر کچھ عمل بھی ہوا ہے مگر دراصل دفعہ ۳۵۰ الف کی روح کو نہیں سمجھا گیا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے دس اور چالیس کے مطالبے کی شرط دراصل ایک انتظامی شرط ہے، اصولی شرط نہیں ہو سکتی۔ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کا انتظام حکومت کو ہر جگہ خود کرنا چاہئے۔ اگر دس اور چالیس کی شرط کی وجہ سے یہ انتظام نہ ہو سکا تو ایک بڑی کوتاہی ہوگی۔ پھر مسئلہ صرف ایک استاد مقرر کر دینے کا نہیں ہے۔ استادوں کی تربیت اور کتابوں کی فراہمی کا بھی ہے، جب کہیں بسیں چلائی جاتی ہیں تو پہلے اُن کے لئے ضروری ساز و سامان فراہم کرنے کے لئے کارخانے اور ڈپو بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح کسی اسکول میں اردو کے استاد کی جگہ منظور کرنا کافی نہیں، اردو کے استادوں کی تربیت اور کتابوں کی تیاری اور وقت پر ملنے کا انتظام کرنا بھی ضروری ہے۔ ثانوی منزل پر تین قسم کے کام ہیں۔ ایک سہ لسانی فارمولے کی رو سے اردو کا تیسری زبان کے طور پر پڑھانا۔ دوسرے اردو کا اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھانا تیسرے اردو کے ذریعے سے تمام مضامین کی تعلیم دینا جہاں اردو کا علیحدہ اسکول قائم کرنا آسان نہ ہو، وہاں ہندی کے ساتھ اردو ذریعہ تعلیم کے درجے متوازن طور پر تو قائم کئے ہی جا سکتے ہیں۔ اس منزل کے استادوں کی تربیت اور ان تینوں اقسام کے لئے کتابوں کی تیاری کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے، اس لئے سب سے پہلے حکومت ہند کو چاہئے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے تمام ضروریات کو پورا کرے۔ اس کے بعد کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اردو کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھانے اور اردو کالج قائم کرنے اور اس کے بعد ایک یا ایک سے زیادہ اردو یونی ورسٹی قائم کرنے کا مسئلہ آتا ہے۔ مگر ابتدائی اور

ثانوی تعلیم کی بنیاد جب تک مضبوط اور ہر طرح قابلِ اطمینان نہ ہوجائے، اردو یونیورسٹی کا قیام مفید نہ ہوگا۔ ہاں اس کے لئے تیاری یعنی کتابوں کی تیاری، درس و تدریس کے مسائل پر غور و خوض اور اس سلسلے میں ریسرچ جلد سے جلد ہونی چاہئے کیونکہ اس کے بغیر یونیورسٹی کا قیام اتنا فائدہ مند نہ ہوگا۔ اس کے بعد زبان کے چلن کے سلسلے میں سہولتوں کا سوال آئے گا۔ یعنی اردو میں قوانین ڈھل جائیں، اعلانات اردو میں ہوں، سڑکوں پر ہدایات اردو میں ہوں، دو شہروں کی فہرستیں اردو میں ہوں، اردو میں خطوں کے جوابات سرکاری دفاتر سے اردو میں ملیں، اردو میں عرضیاں لی جائیں اور مجالس قانون ساز میں اردو میں تقریر کی اجازت ہو۔ ان معاملات میں اکثریت اور حکومت کو یہ دیکھنا چاہئے کہ لسانی اقلیتوں کو یہ سہولتیں ملیں گی تو ہندی کو کوئی نقصان نہ ہوگا، صرف اردو والے قومی اور سماجی کاموں میں زیادہ حصہ لے سکیں گے۔

ادب کے فروغ کا مسئلہ زبان کے فروغ کے ساتھ وابستہ ہے۔ چند اچھی کتابوں پر انعامات دینا یا ادیبوں کی ہمت افزائی کرنا بھی اچھی بات ہے، مگر اچھا ادب منصوبہ بندی یا محض حکومت کی سرپرستی سے پیدا نہیں ہوتا۔ کتابوں پر انعامات دینا چاہئیں، ادیبوں کی ہمت افزائی بھی کرنی چاہئے۔ مگر زیادہ ضروری یہ ہے کہ اردو کے نئے لکھنے والوں کو اپنی تخلیقات چھپوانے کے مواقع ملیں انھیں اپنے مضمون پر مواد جمع کرنے کے لئے سہولت ہو، حوالے کی کتابیں کثرت سے شائع ہوں، طباعت کے لئے آسانیاں مہیا کی جائیں۔ اچھے پریس قائم ہوں، اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے لئے کاغذ مقررہ نرخ پر ملے، کالے بازار سے نہ خریدنا پڑے۔ امید ہے کہ مختلف کمیٹیاں جو مختلف ریاستوں میں اردو کے فروغ کے لئے تدابیر سوچ رہی ہیں وہ ان پہلوؤں کو ضرور ذہن میں رکھیں گی۔ اردو کا کام قومی یک جہتی کا کام ہے۔ اردو کی ترقی میں جو رکاوٹیں محسوس ہوتی ہیں انھیں کی وجہ سے بعض اوقات کچھ حلقوں میں علیحدگی پسندی کا جذبہ ابھرتا ہے اگر اردو کے فروغ کے لئے اور خوش دلی اور ولولے سے حکومت قدم اٹھائے اور عوامی قدم اٹھائے تو قومی یک جہتی اور قومی وحدت بڑھے گی اور پھیلے گی۔ اردو دوستوں کو بھی تعمیری ذہن بنانا ہوگا، محض ماتم اور فریاد سے کچھ نہ ہوگا، اعداد و شمار فراہم کرنے ہوں گے اور بنیادی اور فروعی باتوں میں فرق کرنا ہوگا، پھر فوری اور طویل عرصے کے کاموں کی بھی درجہ بندی کرنی ہوگی۔ حقیقی اور پائیدار کام اسی طرح ہوتا ہے۔

اردو مضمون نگاری کا مقابلہ

لکھنؤ۔ اردو فارسی سوسائٹی لکھنؤ یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام اردو مضمون نگاری کے ایک کل ہند انعامی مقابلے کے لئے "اردو ادب میں حب الوطنی کے عناصر" کا عنوان طے پایا ہے۔

مضمون بھیجنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی ڈگری کالج یا یونیورسٹی میں بی۔ اے یا ایم۔ اے کا باقاعدہ طالب علم ہو اور مضمون اس کا لکھا ہوا ہو۔ اس کے ساتھ صدر شعبہ یا پرنسپل کے دستخط اور مہر کے ساتھ تصدیق بھی ہونی چاہئے۔

مضامین ۲۰ جنوری تک سوسائٹی کو موصول ہوجانے چاہئیں مضمون زیادہ سے زیادہ ایک ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہئے اور خوشخط لکھا ہونا چاہئے۔

مضمون اس پتہ پر ارسال کئے جائیں۔ شہاب الدین صدیقی کنوینر انعامی مقابلہ و جنرل سکریٹری اردو فارسی سوسائٹی، شعبۂ اردو فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ۔

• قومی آواز لکھنؤ

اردو مصنفین کی بہترین کتب پر انعامات

حیدرآباد۔ اردو زبان کی ترقی اور اشاعت کے لئے حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے قائم کردہ کمیٹی نے پچھلے برسوں کی طرح اس بار بھی آندھرا پردیش کے اردو مصنفین کی بہترین کتابوں پر انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے یکم جنوری ۱۹۷۵ء سے ختم دسمبر ۱۹۷۶ء تک کی اردو مطبوعات (نثر، سائنس اور عام معلومات سے متعلق) کے لئے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں کم سے کم ایک ایسی بھی ہونی چاہئے جو بچوں کے لئے مفید ہو۔ آندھرا پردیش کے مصنفین سے خواہش کی گئی ہے کہ وہ اپنی مطبوعات کے چار چار نسخے جناب عابد علی خاں معتمد کمیٹی کے پاس دفتر اردو کتب خانہ جواہر لال نہرو روڈ کے پتہ پر ختم جنوری ۱۹۷۷ء تک روانہ کردیں۔

• سیاست حیدرآباد

سہ ماہی صبح کا۔ روش نمبر شائع ہوگیا

اس نمبر میں اردو کے مشہور ادیبوں کے مضامین اور تاثرات شامل ہیں، مثلاً پروفیسر آل احمد سرور، جناب مالک رام، جناب علی جواد زیدی، مولانا شاہ معین الدین ندوی، جناب ضیاء الحسن فاروقی، جناب گوپال متل، جناب انور صدیقی، مولانا رضا انصاری، جناب ملک زادہ منظور احمد، محترمہ حمیدہ سلطان، جناب جمیل مہدی وغیرہ۔ اس میں روش صدیقی مرحوم کے کلام اور نثر کا نمائندہ انتخاب بھی شامل ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ساڑھے تین روپے۔ ملنے کا پتہ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کوچہ پنڈت۔ دہلی ۶

ذکاء الدین شایاں

تحقیق اور ادب

تحقیق کیا ہے؟ دیگر شعبوں سے الگ ہو کر ادب کے دائرے میں اس کا کیا عمل ہوتا ہے اور کیا ہونا چاہئے؟ "تحقیق" ادب سے معاونت کرکے ادب کی روح کو جلا بخشتی ہے؟ یا ادب بیزاری کا جذبہ پیدا کرتی ہے؟ عام تحقیق اور ادبی تحقیق میں کیا "واقعتہً" کوئی فرق ہے؟ — ادب کے شعبہ میں تحقیق کے اِن مسائل کو نظر انداز کر دینا اور اِن کے مناسب حل پر غور نہ کرنا، ادب سے درپردہ ایک قسم کی دشمنی رکھنے کے مترادف ہے جو کسی صورت میں موزوں نہیں۔

تحقیق اپنے لغوی معنی میں تلاش و جستجو، دریافت، بازیافت اور چھان بین کا نام ہے۔ اس میں محکمہ سراغ رسانی کے عمل اور مجرم کی تفتیش و گرفتاری سے لے کر ادب جیسے جمالیاتی فن کے جملہ پہلوؤں کی تلاش اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کا مفہوم شامل ہے۔

تحقیق کا سلسلہ جب ادب کے ساتھ قائم کیا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اب تحقیق کو سائنس داں کے تجربہ گاہ، فلسفی کے کمرے، عدالت کے صحن، مجرموں کے کٹہرے اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کی "مکروہ" فضا سے آزاد کرکے جمالیات کے چمن زار میں لایا جا رہا ہے۔ اس ادبی تحقیق کی دنیا دوسرے شعبوں کی تحقیق سے قطعی مختلف ہے۔ یہاں فردِ جرم تیار کی جاتی ہے، نہ مجرموں کو پھانسی دینے کا حکم سنایا جاتا ہے اور نہ بحث و تفتیش سے ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے انسانی ذہن، ادب سے لگاؤ رکھنے کے بجائے اس سے نفرت کرنے لگے۔ اسی قسم کی تحقیق جو ادب کے شیدائی کو ادب سے دور کر دے غیر ادبی تحقیق کہلانے کی مستحق ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ تحقیق کے وقت محقق کو غیر جانبداری سے کام لے کر "سائنٹفک طریقہ" کا اپنانا لازم ہے۔ لیکن "غیر جانبداری" اور "سائنٹفک" جیسی اصطلاحوں کا اصلی مفہوم کیا ہے؟ — کیا غیر جانبداری کے یہ معنی ہیں کہ محقق، ادب کے مطالعے اور اس کی روح، لطافت اور کیفیت سے بھی بے نیاز ہو جائے؟ اور ادب کو منطق، ریاضی، جرائم، اور سراغ رسانی کے حدود میں لاکر بال کی کھال نکالنا شروع کر دے۔ سب جانتے ہیں کہ سائنس کی تمام تر بنیاد جزیات پر قائم ہے۔ وہ ہر شئے کی ماہیت کو ٹکڑوں میں دیکھنے کی عادی ہے۔ اس کے برخلاف ادب مجموعی تاثر سے واسطہ رکھتا ہے۔ ادب کی تحقیق میں سائنسی "طریقہ" کار اس حد تک تو کارآمد ہو سکتا ہے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے کے لئے جزیات کو ایک ذریعہ بنا لے لیکن یہ ذریعہ تحقیق کا مقصد نہیں ہونا چاہئے۔ ادب کے شعبے میں تحقیق کی آخری منزل بھی — اپنی تمام تخلیقی بے ربطگی اور جزوی طریق کے باوجود — ادبی تخلیق کی جِلا، روشنی اور روح سے غیر متعلق نہیں رہ سکتی۔

شیکسپیر نے اپنی شاعری اور المیہ ڈراموں کی تخلیق سے انگریزی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس کی تخلیقات ملکہ الزبیتھ کے عہد ہی میں مقبول نہیں ہوئیں بلکہ ان کی آفاقیت نے انگلستان کے باہر کی فضا کو بھی صدیوں تک متاثر کیا ہے۔ اور آج بھی شیکسپیر کی ذات انسانی محسوسات، نفسیات اور اعمال پر اسی طرح گرفت ہے۔ محققین نے شیکسپیر کے ڈراموں کا بغور مطالعہ کرکے ان کے کردار، تاریخی واقعات، ٹریجڈی کی نوعیت، انسانی احساسات، مجبوری و بے کسی، فضا اور مناظر و مظاہر کے نئے نئے گوشے دریافت کئے جن سے شیکسپیر کے ڈراموں کی قدر و قیمت متعین کی گئی۔ اور ان کی روح کے پوشیدہ نکات تک رسائی حاصل ہوئی۔ اس طرح بحیثیت مجموعی تحقیق کے ذریعہ شیکسپیر کی تخلیقات سے مزید ادبی اور جمالیاتی تعلق پیدا ہوا۔ تحقیق کا یہ رخ مثبت اور ادبی ہے۔ کیونکہ یہ شیکسپیر کے ادب پاروں کی روح تک رہنمائی کرتا ہے اور فنکار کے مزاج اور اس کی شخصیت سے وابستہ ہے۔ لیکن اگر کوئی محقق ان سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اور شیکسپیر کی نگارشات کی ادبی کیفیات سے ناآشنا ہو کر تحقیق کا یہ انداز اختیار کرے کہ — شیکسپیر عیسائی تھا یا مسلمان؟ وہ گوشت مچھلی کھاتا تھا یا ساگ پات؟! اس کی دو بیویاں تھیں یا ایک؟ اس کے تین بھائی تھے یا چار؟ ان کا نام یہ تھا یا وہ؟ شیکسپیر کی محبوبہ عورت تھی یا امرد؟ اس نے اپنی محبوبہ کو دس خطوط لکھے یا بارہ؟ تحفہ میں انگوٹھی پیش کی یا رومال؟ شیکسپیر کے بالوں کا رنگ سیاہ تھا یا سنہرا؟ — وہ "شیخ پیر" تھا یا شیکسپیر؟ اس نے فلاں نظم جمعہ کو لکھی تھی کہ ہفتہ کو؟ اس کے تمام ڈرامے اس کے اپنے قلم کے لکھے ہوئے تھے یا نوکر کے؟ شیکسپیر کا خط سیدھا تھا یا ترچھا؟ وہ "پی" کا حرف کس طرح بناتا تھا؟ وہ لفظ "آئی" پر نقطہ لگاتا تھا یا نہیں؟ وہ ڈرامہ لکھتے وقت کاغذ کے ایک جانب حاشیہ چھوڑتا تھا یا دونوں جانب؟ — ظاہر ہے شیکسپیر کے متعلق متذکرہ بالا معلومات بھی تحقیق ہی کہلائی جائے گی۔ لیکن کیا ایمانداری کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی تحقیق کا ادب سے بھی کوئی تعلق ہے؟ کیا یہ ادب کے شعبہ کی تحقیق ہو سکتی ہے؟ یہ تحقیق شیکسپیر کے فن پاروں کو روشن کرنے میں معاون ہے یا اس سے الگ فنکار کی فردِ جرم مرتب کرنے کے درپے ہے؟ میرا خیال ہے کہ تحقیق کا یہ طریقہ کار قطعی غیر ادبی اور منفی ہے کیونکہ یہ ہمیں شیکسپیر کی فنکارانہ شخصیت اور اس کے ادب پاروں سے دور رکھتا ہے۔ اور اس سے جمالیاتی احساسات۔ جو ادب کی اساس ہیں۔ مجروح ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تحقیق، محقق کے مباحث، اختلافات اور نظریات کو اتنی شدت کے ساتھ سامنے لاتی ہے کہ غریب فنکار اپنے فن کو لئے ہوئے ان کے درمیان سے نکل جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

غالب ہندوستان کا ایک مستند اور بلند پایہ فنکار ہے۔ اس کی شخصیت اور شاعری نے محققین کو ادبی، فنی اور جمالیاتی راہوں اور منزلوں کی نئی سمتوں سے روشناس ہونے کی ترغیب دی ہے۔ آج تک غالب پر کسی نہ کسی زاویے سے مثبت تحقیق جاری ہے جس کے ذریعہ اس کے فن و شعر کے نہاں خانوں تک انسانی ذہن کی رسائی ممکن ہوئی ہے۔ اور اس طرح غالب کی شاعری کا معیار اور مرتبہ متعین ہوتا رہا ہے۔ لیکن دوسرے سرے پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ منفی اور غیر ادبی تحقیق نے غالب کو ادب، فن، جمالیات، انسانی احساسات اور شاعری کی دنیا سے نکال کر کاتبوں کی صف میں لا بٹھایا ہے۔ یہاں تحقیقی مباحث یہ نہیں ہیں کہ غالب کے شعور فن اور فکر و تخیل کی قدر و بلندی کیا ہے؟ بلکہ یہاں تو تمام تحقیقی زور غالب کو کاتب ثابت کرنے میں صرف ہو رہا ہے۔ ایک شاعر اور کاتبوں کی قطار میں — میں سمجھتا ہوں غالب کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے اور اس کی "حقیقت" تک پہنچنے کا یہ تحقیقی عمل انتہائی گمراہ کن ہے۔

غالب کے عہد میں اور اس کے بعد تک خوش نویسی اور کتابت کا فن، تعلیم کا ایک اہم جزو تھا۔ شعراء، علماء اور اطبا ہی نہیں عام تعلیمی استعداد رکھنے والے اشخاص بھی خوش نویس ہوتے تھے۔ اور ان کے خط میں بڑی مشابہت پائی جاتی تھی۔ طبیبوں کے نسخے اپنی تحریری وضع میں بڑی یکسانیت رکھتے تھے۔ اسی طرح خوش نویسوں، کاتبوں، شاعروں اور عام تعلیم یافتہ لوگوں کی تحریریں — دائرے، مراکز اور طرز نگارش کے اعتبار سے — نظر کو دھوکا دے سکتی تھیں۔ کاتب حضرات دوسروں کے خط کو اسی انداز میں نقل کرنے کی مہارت رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں کتابت کو بنیاد بنا کر اس عہد کے فنکاروں کی تحریر میں کوئی منفرد مقام متعین کرنا خود طلب مسئلہ ہے۔ جس پر سرسری رائے دینا خطرناک ہے۔ ویسے بھی یہ تحقیق "قیاس" "مفروضے" "گمان" اور "امکان" جیسی اصطلاحوں کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ جن کی حیثیت اور منزل خود مشکوک رہتی ہے۔

"دیوان غالب قلمی نسخہ بھوپال"، "دیوان غالب بخط غالب" کے سلسلے میں ادھر کچھ دنوں سے بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خطوط کی آنچ شدت اور گرم بازاری ہے۔ اور ان کی قلمی تحریروں پر تحقیق کا آتنا زبردست جھکاؤ ہو گیا ہے کہ شبہ سا ہونے لگتا ہے کہ غالب واقعی کہیں کاتب ہی نہ ہوں۔ غالب کے ان محققین کا کیا مطمع نظر ہے؟ وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ کچھ ثابت کرنا چاہتے بھی ہیں یا نہیں؟ یا یہ تمام تماشا فریقین کے اپنے نظریات اور اپنے خیالات کی حیثیت منوانے کے سوا اور کچھ نہیں جس کا تعلق غالب کی قلمی تحریر، خط اور کتابت سے ہو تو ہو بہر حال ان کی شاعری اور فن کی جملہ باریکیوں سے بالکل نہیں۔ یہ تمام باتیں تشریح طلب ہیں۔ ان تحقیقات کا انداز محکمۂ سراغرسانی کی کارکردگی اور مجرم کی تفتیش اور گرفتاری سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ وہی ہاتھ پاؤں اور انگلیوں کے نشانات سے مجرم کی شناخت، وہی رویہ اور وہی طریقۂ کار۔ غالب اپنے ہاتھ کی تحریر اور کتابت سے اب مجرم بن چکے ہیں۔ کسی وقت بھی گرفتار کئے جا سکتے ہیں۔

یہاں پھر وہی مسئلہ سامنے آجاتا ہے کہ ادب کے شعبے میں تحقیق کا کیا عمل و طریق ہونا چاہئے؟ میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اس وضع کی تحقیق، ادب کے سچے طالب علم اور قاری کے لئے بڑی صبر آزما ہوتی ہے۔ ان محققین کی تحقیقی عبارات کا مطالعہ قاری کے ذہن کو کسی ادبی تاثر یا نتیجے سے ہم کنار نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ان میں فن اور فنکار کا ذکر اور وجود تقریباً غائب ہوتا ہے۔ حوالوں اور راویوں، دیگر محققین اور معترضین کے اقتباسات۔ صاحب مضمون کے قیاسات، مفروضات اور نظریات کے ہجوم میں سے فنکار کا فن اور خود فنکار خاموشی سے باہر چلے جاتے ہیں۔ یہاں تو ہر محقق کو اپنی اپنی بات "ثابت" کرنا ہوتی ہے۔ دوسروں کے اعتراضات کا جواب دینا ہوتا ہے۔ ایسی فضا میں عدالت کی کیفیت تو پیدا ہو سکتی ہے لیکن ادب کی لطافت نہیں۔

ڈاکٹر وحید اختر نے اپنے حالیہ مضامین میں کئی جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تنقید اور تخلیق کی دوئی کو ختم ہونا چاہئے۔ میں اس سے بالکل متفق ہوں۔ وہ نقاد، جو فنکار اور ادب پاروں کی روح میں اترے بغیر، اپنے مجرد نظریات کی مدد سے تنقید نگاری کا فن اختیار کرتا ہے، ادب کا ناقد نہیں ہو سکتا۔ تنقید نگار کا عمل دوہرا ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ تخلیق اور خالق سے ادبی اور جمالیاتی رابطہ قائم کرتا ہے اور دوسری سمت میں سچے نقاد کے فرائض انجام دیتے ہیں — بالکل یہی صورت تحقیق کے میدان میں ہے۔ ادب کے شعبے میں محقق اگر یہ اعلان کرے کہ اسے تخلیق اور فنکار کی روح سے کوئی واسطہ نہیں، نہ ادب کے مطالعہ سے تعلق ہے اور نہ اس کی لطافت و کیفیات سے کوئی غرض ہے، اس کا تو کام ان تمام چیزوں سے بے نیاز اور غیر جانبدار ہو کر صرف حقیقت کی تلاش ہے تو میرا خیال ہے کہ ایسے محقق کو ادب کے دائرے سے ہٹ کر کسی دیگر شعبہ میں تحقیق کرنا مستحسن ہے۔ کیونکہ یہ منفی اور غیر ادبی تحقیق ہوگی جو اپنے طریق اور عمل میں اس "حقیقت" تک رسائی حاصل کرے گی جس کی منزل میں ادب و تخلیق کی نہ کوئی روح ہوگی اور نہ روشنی — یعنی تحقیق کی دنیا میں بھی مثبت اور ادبی رخ اختیار کرنا لازم ہے۔ ادبی تحقیق، تخلیق سے نا آشنا نہیں رہ سکتی — وحید اختر کے الفاظ میں تحقیق اور تخلیق کی دوئی کو بھی ختم ہونا چاہئے۔

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ منیجر

سید فضل امام رضوی

"ابوالکلام آزاد: فکر و فن"

۱۵ر دسمبر ۱۹۸۱ء کے "ہماری زبان" میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے مقالۂ پی۔ ایچ۔ ڈی "مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و فن" کی اشاعت پر اپنی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔

موصوف کی مایوسی کا اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید انھوں نے مقالے کے صرف ابتدائی اوراق کا محض سرسری طور پر مطالعہ کیا ہے اور پوری کتاب کے مطالعے کی زحمت نہیں فرمائی، ورنہ سنین کے اندراج میں جو کہیں دو ایک غلطیاں ہوگئی ہیں وہ ان کو سہو کتابت پر محمول کرنے کے لئے خود کو مجبور پاتے

۱۔ فکر و فن کے صفحہ ۴۴ پر حالی سے لسان الصدق کے ایڈیٹر آزاد کی ملاقات کا سال ۱۹۰۱ء بتایا گیا ہے۔

دسنوی صاحب کہتے ہیں :۔

"۱۹۰۱ء میں لسان الصدق کب شائع ہوا؟ اس کا پہلا پرچہ ۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء کو منظر عام پر آیا۔"

اگر دسنوی صاحب امعان نظر سے اگلے صفحات کا مطالعہ کرتے تو اسی کتاب میں صفحہ ۹۳ پر ان کو یہ لکھا ہوا ملتا

"۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء کو اس کا (لسان الصدق کا) پہلا شمارہ مولانا نے شائع کیا۔"

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صفحہ ۴۴ پر ۱۹۰۱ء کا اندراج کتابت کی غلطی ہے ورنہ جو شخص لسان الصدق کے اجرا کا سال ۱۹۰۳ء بتاتا ہے وہ ۱۹۰۱ء میں لسان الصدق سے آزاد کا تعلق کیوں کر بتا سکتا ہے۔

یہ اسی قسم کی کتابت کی غلطی ہے جو دسنوی صاحب کی کتاب "مضامین لسان الصدق" کے مقدمہ کے پہلے جملہ میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً

"۲۲ر فروری ۱۹۵۵ء کو جب مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ہوا، تو سارے ملک میں غم اور افسوس کی لہر دوڑ گئی۔"

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے مولانا ابوالکلام آزاد ایڈیٹر لسان الصدق کا انتقال ۱۹۵۵ء میں نہیں بلکہ ۱۹۵۸ء میں ہوا تھا۔

۲۔ مولانا شبلی کی ملاقات مولانا آزاد سے کب ہوئی، اس کے بارے میں محققین میں اختلاف رائے ہے۔ بعض نے اوائل ۱۹۰۵ء بتایا ہے اور بعض نے ۱۹۰۴ء۔ ڈاکٹر ملک زادہ نے دوسری روایت کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے "علامہ شبلی کی حیات معاشقہ" میں بھی اسی روایت کو جگہ دی ہے۔ شبلی کے اب تک جو خطوط ملے ہیں اور ان کے جو حالات سفر معلوم ہوئے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے ۱۹۰۴ء میں بمبئی کا سفر کیا تھا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دونوں کی ملاقات ۱۹۰۴ء میں ہوئی ہوگی۔ اگر دسنوی صاحب کے قول کے مطابق ۱۹۰۵ء کو صحیح تسلیم کیا جائے تو ان اقوال کی مدلل تردید کرنی پڑے گی جو ۱۹۰۴ء کے حق میں ہیں۔

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے مقالے میں ہے کہ مولانا آزاد نے الندوہ کی ایڈیٹری قبول کی۔ دسنوی صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ کے کبھی ایڈیٹر نہیں رہے، البتہ چھ ماہ کے لئے سب ایڈیٹر رہے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر کی تفریق کیوں کی گئی جبکہ الندوہ میں اس قسم کی کوئی صراحت ایڈیٹری کے متعلق نہیں ہوتی تھی۔

۳۔ "گلدستہ نیرنگ عالم" کے سلسلے میں ملک زادہ کا یہ بیان ہے کہ :۔

"یہی وہ وقت تھا جب مولانا نے نیرنگ عالم نامی گلدستہ بھی جاری کیا جس کے صرف آٹھ نمبر نکل سکے۔"

"یہی وہ وقت تھا" پر دسنوی صاحب کو اعتراض ہے۔ مگر یہاں ڈاکٹر ملک زادہ نے مولانا کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے نیرنگ عالم کی اشاعت کا ذکر کیا ہے۔ "نیرنگ عالم" ایک شعری گلدستہ تھا اور بجا طور پر اسی کی اشاعت کا محرک مولانا کے جذبۂ شعر گوئی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ملک زادہ نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا، اسی ضمن میں انھوں نے نیرنگ عالم کا بھی نام لیا اس کے سال اشاعت پر انھوں نے کوئی بحث ہی نہیں کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر ملک زادہ کو اس کے سال اشاعت کا علم تھا تب تو انھوں نے یہ کہا کہ مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز اس وقت ہو چکا تھا جب ان کی عمر محض گیارہ سال کی تھی۔ اس حقیقت کے پیش نظر "یہی وہ وقت تھا" پر اعتراض کی کوئی گنجائش بظاہر معلوم نہیں ہوتی۔

۴۔ "المصباح" کے ایڈٹ کے سلسلہ میں بھی دسنوی صاحب کو ڈاکٹر ملک زادہ کے سن تاریخ سے اختلاف ہے۔ ملک زادہ نے لکھا ہے :

"پہلا اخبار جسے مولانا نے ایڈٹ کیا، اس کا نام "المصباح" تھا یہ ۱۹۰۰ء کے اواخر کی بات ہے۔"

اشاعت اور ایڈٹ میں بڑا فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ جو اخبار عید کے موقع پر ۱۲ر جنوری کو شائع ہوا ہوگا، اس کے پہلے ایڈٹ ہو چکا ہوگا۔ مختلف روایات کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے یہاں "سن ایڈٹ" بتایا ہے نہ کہ سن اشاعت۔

۵۔ ایک جگہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے لکھا ہے کہ مولانا نے "کئی" مضامین لکھ کر مخزن میں بھیجے جو شیخ عبدالقادر کی ادارت میں نکل رہا تھا۔

دسنوی صاحب کا لفظ "کئی" پر اعتراض ہے کیونکہ مخزن میں مولانا کے صرف دو مضامین شائع ہوئے۔ اسی صفحے پر ڈاکٹر ملک زادہ نے مولانا آزاد کا وہ قول بھی نقل کیا ہے جس میں مولانا نے خود "چند" مضامین بھیجنے کا اقرار کیا ہے۔ دسنوی صاحب نے تو خود "مضامین لسان الصدق" کو مرتب کیا ہے۔ اس لئے انھیں بخوبی معلوم ہوگا کہ اس میں مولانا آزاد نے کیا کیا لکھا تھا۔ مولانا آزاد نے اپنے نوٹ کے ساتھ مخزن کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر کے یہ الفاظ "لسان الصدق" میں نقل کئے تھے:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولوی صاحب (مولانا ابوالکلام آزاد) کے نام سے ہمارے ناظرین خوب واقف ہیں۔ مخزن کے اوراق میں ان کے "متعدد" مضامین نکل چکے ہیں۔"

کیا مولانا آزاد کے "چند" اور شیخ عبدالقادر کے "متعدد" کے بعد بھی ڈاکٹر ملک زادہ منظور کے لفظ "کئی" پر اعتراض کی گنجائش ہے۔

۶۔ "احسن الاخبار" کے بارے میں ڈاکٹر ملک زادہ نے لکھا ہے:۔

"سنہ ۱۹۰۱ء میں مولانا کا تعلق احسن الاخبار سے ہو گیا جو ان کی صحافتی زندگی میں مولانا کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ۔ ۔ ۔ احسن الاخبار میں مولانا نے ہر طرح کے مضامین لکھے، کچھ مضامین کی وجہ سے بحث و مباحثہ کا ہنگامہ بھی چھڑا، جس میں اشہری مرحوم اور بعض اور کہنہ مشق مضمون نگار حضرات نے حصہ لیا۔"

یہاں اعتراض یہ ہے کہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے صرف "آزاد کی کہانی" پر اکتفا کر لیا ہے، دوسرے حوالوں سے احسن الاخبار سے مولانا آزاد کے تعلق پر روشنی نہیں ڈالی اور اس طرح انھوں نے حقائق کی تلاش نہیں کی۔ جہاں تک میرا خیال ہے ڈاکٹر ملک زادہ نے تو صاف طور پر مولانا آزاد کا تعلق واضح کر دیا ہے معلوم نہیں اور کس قسم کی وضاحت درکار ہے خود دسنوی صاحب نے "مضامین لسان الصدق" کے صفحہ ۱۲ پر اس کے علاوہ کچھ اور نہیں لکھا:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ جلد ہی (مولانا آزاد) نثر کے میدان میں اتر آئے۔ کلکتے کے "احسن الاخبار" اور "تحفۂ احمدیہ" کو اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔"

ڈاکٹر ملک زادہ نے تو یہاں اپنے ماخذ کا بھی حوالہ دے دیا ہے: "ابوالکلام آزاد: فکر و فن" پر قلم اٹھانے سے پہلے قابل تنقید نگار کو کم از کم اپنے ان جملوں کو بھی پیش نظر رکھنا تھا جو کبھی ان کے قلم سے نکل کر عام ہو چکے ہیں۔

دسنوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا آزاد نے اپنے مضمون "سید احمد حسن اب کہاں ہیں؟" میں اپنے اور احسن الاخبار کے تعلق کے بارے میں کچھ بھی تحریر نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر ملک زادہ نے اس کا دعویٰ کہاں کیا کہ مولانا آزاد نے اپنے اور احسن الاخبار کے تعلق پر روشنی ڈالی ہے۔

۷۔ "خدنگ نظر" کے بارے میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے لکھا ہے:۔

"۱۹۰۳ء میں مولانا آزاد کو "خدنگ نظر" لکھنؤ کے حصۂ نثر کی ایڈیٹری ملی۔ یہ گلدستہ منشی نوبت رائے نظر لکھنؤ سے نکالتے تھے۔ اس میں نثر کا حصہ بھی شامل کیا گیا۔" اس عبارت پر یہ حاشیہ آرائی کی گئی ہے:۔

"مندرجہ بالا تحریر سے محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں مولانا آزاد "خدنگ نظر" کے حصۂ نثر کے ایڈیٹر ہوئے اور اس کے بعد ہی سے اس ماہنامہ میں نثر کے حصے کا اضافہ ہوا۔"

ملک زادہ کی عبارت بالکل واضح ہے۔ اس میں دو باتیں کہی گئی ہیں، ایک یہ کہ مولانا آزاد کو "خدنگ نظر" کے حصۂ نثر کی ایڈیٹری ملی اور دوسری یہ کہ "خدنگ نظر" ایک گلدستہ تھا جس میں نثر کا حصہ بھی شامل کیا گیا تھا۔ یہ کب کہا گیا ہے کہ مولانا آزاد جب ایڈیٹر ہوئے تو اس کے بعد حصۂ نثر بڑھایا گیا اور اس کا کب انکار کیا گیا کہ "خدنگ نظر" کی ادارت میں شامل ہونے سے پہلے انھوں نے اس میں مضامین نہیں لکھے؟

۸۔ ایک جگہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے ملیح آبادی کی روایت نقل کی تھی کہ لسان الصدق کے اجرا میں "جو جذبہ ہنگامی اور وقتی طور پر کارفرما تھا وہ محض یہ تھا کہ مبادلے میں اخبارات حاصل کئے جائیں"۔ دسنوی صاحب اس جذبے کی صداقت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل سمجھتے ہیں۔

مضامین "لسان الصدق" کے مرتب ہونے کے باوجود اس جذبہ سے ناواقفیت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کم از کم اس سلسلے میں "لسان الصدق کا مبادلہ" کے زیر عنوان مولانا آزاد کی تحریر ہی دیکھ لینا چاہئے تھی۔ "لسان الصدق" کی ضخامت کے بارے میں بھی ملیح آبادی کی روایت سے اختلاف کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس باب میں ڈاکٹر ملک زادہ نے تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی کہ کتنی بار اور کب کب اضافے ہوئے لیکن کیا ان کا یہ قول غلط ہے کہ چھ ماہ بعد اس کی ضخامت میں اضافہ کر دیا گیا؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مئی ۱۹۰۴ء میں (یعنی اشاعت سے چھ ماہ بعد) اس کی ضخامت ۳۲ صفحات کر دی گئی؟

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

مراسلات

ایک مراسلے کے جواب میں

ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے علم و ادب کی ترقی کے لئے "حریت فکر" کی اہمیت پر زور دیا تھا لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ اردو میں "حریت فکر" کی موجودہ زمانے میں گنجائش کم ہوتی جاتی ہے۔ ہماری زبان کے ۲۲ر دسمبر ۱۹۷۰ء کے شمارے میں "بکٹ کہانی" کے اس متن کی حمایت میں جو پروفیسر مسعود حسین خاں کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے ایک مراسلہ نظر سے گزرا اس میں ایک سے زائد مرتبہ میری بابت یہ فتوی صادر کیا گیا ہے کہ میں "متنی تنقید اور تشکیل متن کے اصولوں سے ناواقف" ہوں۔ مجھے اپنی معلومات کا ہرگز کوئی زعم نہیں، میرا معاملہ یہ ہے کہ میں مسائل کو سمجھنا چاہتا ہوں لیکن ہمارے بعض بزرگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ عموماً پوری بات کہتے ہی نہیں اور ہمارے ذہنوں کو اپنی تحریروں سے الجھا دیتے ہیں مثال کے طور پر بکٹ کہانی کے جس نسخے کو پروفیسر مسعود حسین خاں نے سب سے قدیم اور مستند "تسلیم کیا ہے اس کے ترقیمے کی ایک سے زاید اطلاعات درج نہیں کی گئیں (کاتب نے اپنا نام بھی لکھا تھا وہ بھی اس نسخے کا تعارف کراتے ہوئے نہیں بتایا گیا)۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس میں کیا علمی مصلحت تھی۔ اسی طرح رضا لائبریری رامپور کے نسخے کی بابت ایک صاحب کا کہنا ہے (خدا کرے کہ صحیح نہ ہو) کہ اس پر "از محمد افضل کالپی" لکھا ہوا نہیں ہے یہ الفاظ صرف اس نقل پر لکھے ہوئے ہیں جو پروفیسر صاحب کو موصول ہوئی۔ اس بارے میں تصدیق کر لینی مناسب ہے کیونکہ اس سے مصنف کے وطن کی بابت بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ مطبوعہ متن کے ماخذ میں وہ انتخاب بھی ہے جو پروفیسر محمود خاں شیرانی نے اپنی عالمانہ تصنیف "پنجاب میں اردو" میں شامل کیا ہے۔ مطبوعہ متن (مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں) میں شعر نمبر ۳۰ اس طرح ہے ؎

پیا بن سیجری ناگن بھئی رے سن کھیلن کی سگری سدھ گئی رے

اس کی بابت "اختلاف نسخ" میں شیرانی کے انتخاب سے پہلے ضرب کا نشان (x) اس بات کی علامت ہے کہ مرتبین کے نزدیک یہ شعر اس میں شامل نہیں ہے۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ "پنجاب میں اردو" میں پروفیسر شیرانی نے اس شعر کو نقل کیا ہے جو مطبوعہ متن میں شعر نمبر ۲۹ کے بعد ہونا چاہئے۔ یہ شعر مرتبین نے کس نسخے کی بنیاد پر "پنجاب میں اردو" میں شامل کیا ہے معلوم نہیں۔ مرتبین نے اتنی اطلاع دی ہے کہ نسخہ نمبر ۲ میں بھی یہ شعر اس کے آگے تھا۔ یہ ایک شعر اور اس سے متعلق اختلاف نسخ کے اندراجات اس شبہ کو تقویت دینے کے لئے کافی ہیں کہ مرتبین نے مختلف نسخوں سے متن کا مقابلہ کرنے میں وہ توجہ صرف نہیں کی جس کی ضرورت تھی۔

میں نے عرض کیا تھا کہ مرتبین نے ذیل کا شعر متن میں محض "تسلسل شعری کے پیش نظر داخل" کر لیا ہے

گیا جب جیٹھ تو میں کیا کروں ری پیا کے درد سے بس کھا مروں ری

یہ شعر اس نسخے سے اخذ کیا گیا ہے جس کی بابت مرتبین کو اعتراف ہے کہ اس میں بہت سے "اشعار الحاقی" معلوم ہوتے ہیں۔ کسی دوسری شہادت کی عدم موجودگی میں اس شعر کو متن میں شامل کرنے کا جواز کس اصول کی بنا پر ہے؟

شعر نمبر ۸۸ کی بابت بتایا گیا ہے کہ یہ "صرف" دو نسخوں میں ملتا ہے ان میں ایک تو وہ ہے جسے مرتبین "مستند" خیال کرتے ہیں اور دوسرا وہ جس کی بابت ان کا کہنا ہے کہ "اکثر جگہ غلط ہے" قابل غور بات یہ ہے کہ "اکثر جگہ غلط" نسخے کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسی "اکثر جگہ غلط" نسخے سے ذیل کے شعر بھی اخذ کئے گئے ہیں ؎

چلی کاتک کی رت کیا کیجئے ری سلونے بن نہیں اب جیو دے ری

فراق اب ماہ نے مجھ کو دیا ہے پیا نے مجھ سے انکھوں پھیر لیا ہے

ان نسخوں کی متن میں شمولیت اس نے محل نظر ہے کہ ان کے لئے کوئی دوسری روایت موجود نہیں ہے۔ ایسے اشعار جو صرف کسی ایک نسخے میں مندرج ہیں اور دوسرے کسی نسخے میں نہیں ملتے مرتبین نے قابل ذکر تعداد میں متن میں شامل کر لئے ہیں چنانچہ شعر نمبر ۸۱، ۱۵۵، ۱۵۷ تا ۱۶۱، ۱۸۸، ۲۴۸، ۲۵۰، ۲۶۰، ۲۹۶، ۳۰۱ اسی قبیل سے ہیں۔ تشکیل متن کا کونسا اصول ان کی شمولیت کے لئے جواز پیش کرتا ہے بالخصوص اس وقت جب کہ بعض شعروں میں سابقہ مضمون کی تکرار کے سوا کچھ نہیں۔

مرتبین کے قول کے مطابق صرف تیلی کی روایت سے بکٹ کہانی میں تین سو شعر معلوم ہوتے ہیں، لیکن مطبوعہ متن میں (چار اشعار حذف کرنے کے بعد بھی) شعروں کی موجودہ تعداد تین سو اکیس ہے یقینی طور پر اس روایت کے مطابق بھی مطبوعہ متن میں اکیس شعر الحاقی ہیں۔ اگر مختلف نسخوں میں مندرج شعروں کی تعداد پر نظر کریں تو الحاقی شعروں کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہوگی۔ یہ حقائق ہیں جن کی بنیاد پر میں اس متن کو ناقص سمجھتا ہوں۔

علی گڑھ۔ محمد انصار اللہ

کتابیں درکار ہیں

جس زمانہ میں اردو لغت فارسی میں لکھے جاتے تھے اس دور کی تین کتابیں میرے پاس ہیں۔

ایک غرائب اللغات (از عبد الواسع ہانسوی) } دونوں ایک ہی جلد کے اندر
دوسری نوادر الالفاظ (از سراج الدین علی خان آرزو) } شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان

تیسری نفس اللغت (از رشک لکھنوی) یہ مکمل نہیں۔ صرف چار ابتدائی حروف

(۱) ب ۔ پ ۔ ت ا پر شائع ہے۔

اور چوتھی النفس النفائس (میر حسن) اس میں فارسی کے ساتھ عربی مترادفات کا بھی اضافہ ہے

اس دور کے اور اردو فارسی لغات کا علم اگر کسی صاحب کو ہو تو وہ براہ کرم اس کے مصنف کے نام سے بھی مطلع فرمائیں تو یہ عین عنایت ہوگی۔

فیلن کی ڈکشنری کے بھی دونوں حصے (انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی) کی بھی ضرورت ہے۔ اگر کوئی صاحب اپنا استعمالی نسخہ الگ کرنے پر آمادہ ہوں تو مجھ سے مراسلت فرمائیں۔

دریاباد، بارہ بنکی۔ • عبدالماجد

فلموں کی پبلسٹی سے اردو کا اخراج

اردو اپنی سادگی اور شیرینی کی بنا پر ہندوستانی تھیٹر اور فلموں کی ایک مقبول زبان رہی ہے لیکن ان دنوں پبلسٹی کے کچھ ناعاقبت اندیش اور متعصب فلمسازوں نے اس کے ساتھ جو ناروا سلوک اختیار کر رکھا ہے وہ انتہائی قابل مذمت ہے۔ شمال کے دور پر ادھر کئی سال سے ہمیں نئی فلموں کے پوسٹرز، ہینڈ بلز اور شو کارڈز وغیرہ میں زیادہ تر اردو کا نام و نشان نہیں ملتا حالانکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ملک بھر میں فلموں کا بزنس بڑھانے میں اردو داں طبقہ کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم فلمی صنعت کے دو نمائندہ اداروں (فلم پروڈیوسرز گلڈ اور امپا) سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے سارے ممبروں کو اس بات کی طرف متوجہ کرتے رہیں کہ وہ اپنی فلموں کی پبلسٹی میں اردو کے استعمال کو ضروری سمجھیں ورنہ ایسا نہ ہو کہ آہستہ آہستہ ملک کا اردو داں طبقہ ایسی ساری "اردو فراموش" فلموں کو اپنی سرپرستی سے محروم کرنا شروع کر دے۔

اس سلسلہ میں ہم انجمن ترقی اردو (مرکز) اور اس کی ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی شاخوں سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ جلد سے جلد اس امر سے متعلق اپنے مراسلات (بزبان انگریزی) فلم پروڈیوسرز گلڈ، راج کمل کلامندر کمپاؤنڈ، پریل ٹینکی روڈ اور انڈین موشن پکچرز ایسوسی ایشن، سینڈہرسٹ بلڈنگ، ویٹھل بھائی پٹیل روڈ، بمبئی ۴ کو بھیجنا شروع کردیں ورنہ خود ہماری اپنی بے حسی اور بے عملی سے فلمسازوں میں "اردو فراموشی" کی ایک عادت سی پڑ جائے گی جس طرح سے کہ یہ اب ایک عام رواج بن چکا ہے کہ اردو میں فلمیں بنانے کے بعد بھی ہمارے نااہل فلمساز سنسر بورڈ سے ہندی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

بمبئی • فلمیار جھنگ

ناظم خط کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام دو خط

(۱)

میں کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں ہندی سے ایم۔ اے کر رہا ہوں دراصل میں گلبرگہ کا متوطن ہوں۔ اردو شعبہ یہاں اسی سال سے کھلا ہے اور یہ بات اردو داں طبقے کے لئے واقعی باعث مسرت ہے کہ ابتدائی سال میں ہی طلبہ کی تعداد ۲۸ ہے۔

میں یہاں ہوسٹل میں مقیم ہوں جہاں مختلف مضامین سے طلبہ ایم۔ اے کر رہے ہیں یہاں پر ہندو طلبہ کی کثرت ہے۔ میرا ایک دوست مادھوراؤ کلکرنی ہے جو تاریخ سے ایم اے کر رہا ہے۔ مادھوراؤ کو اردو سیکھنے کا بڑا شوق ہے اور وہ اس کے لئے محنت کے لئے تیار ہے۔ میں نے کچھ ابتدائی قاعدہ بتلا دیا ہے مگر مزید بتلانے کے لئے وقت بہت درکار ہے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا (یہاں مقامی اسٹال کے صاحب نے بھی یہ خوشخبری سنائی) کہ جامعہ والوں نے بھی اردو بذریعہ مراسلت سکھانے کا شعبہ کھول رکھا ہے۔ لہٰذا آپ سے یہ استدعا ہے کہ اس کی مزید تفصیلات سے آگاہ کریں۔ میرا دوست کئی دن سے تقاضا کر رہا ہے۔ وہ ہندی بہتر طور پر جانتا ہے۔ پڑھنا لکھنا بھی ہے اردو رسم الخط سے اسے بڑا لگاؤ ہے۔ جہاں تک ہو سکے آپ ہمیں جواب سے نوازیے گا۔

میں بے چینی سے منتظر رہوں گا۔ امید ہے تمام معلومات فراہم کریں گے۔

دھارواڑ۔ • جمیل تنویر

(۲)

گزارش ہے کہ مندرجہ ذیل امیدواران خط کتابت اردو کورس کے فارم داخلہ بعد تکمیل کے پیش خدمت ہیں۔ نیز امیدواران ہذا کے پورے کورس کے بھیجنے کا ڈاک خرچ حسب الطلب مبلغ عـہ بذریعہ منی آرڈر (فی کس دو روپیہ کے حساب سے) روانہ کئے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ فارم ہذا منی آرڈر کی وصولیابی سے مطلع فرما کر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں گے۔

۱۔ نسرین خانم۔ ۲۔ مہرجبیں خانم۔ ۳۔ فروغ احمد خاں۔ ۴۔ ساجدہ رفیق۔ ۵۔ سید اقبال حسین۔

مندرجہ بالا امیدواروں میں سے اول دو امیدواروں سے خط کتابت میرے نجی پتہ پر کیجئے۔ دیگر امیدواروں سے ان کے نجی پتہ پر کیجئے۔ بقیہ پانچ فارم میرے پاس ہیں انشاء اللہ العزیز وہ بھی جس قدر مکمل ہوں گے بعد تکمیل کے ارسال خدمت کئے جائیں گے۔

جودھپور، راجستھان۔ • ایس۔ این خانم

زبان زندگی اور تعلیم
از
ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین
قیمت: دو روپے
انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ)

اردو ریسرچ ایسوسی ایشن دہلی یونیورسٹی کا جلسہ

شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کے زیر اہتمام اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کا ایک جلسہ زیر صدارت پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن صدر شعبۂ اردو کشمیر یونی ورسٹی منعقد ہوا۔

جلسہ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی نے جناب خواجہ غلام السیدین کے انتقال پر تعزیتی تجویز پڑھ کر سنائی جسے باتفاق رائے منظور کیا گیا۔

اس موقع پر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے "اردو قصائد پر فارسی اثرات" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا جس میں فارسی کے نمائندہ قصیدہ نگار شعرا کی خصوصیات کا تذکرہ کیا اور اردو کے اہم قصیدہ نگاروں پر ان فارسی شعرا کے اثرات کی نشاندہی کی۔

صدر جلسہ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب پر فارسی ادب کے اثرات کی نوعیت اور اس اثر پذیری کے اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے یہ اثرات محض اس وجہ سے مرتب نہیں ہوئے کہ باہر کے آنے والے فاتحین فارسی جانتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں فارسی نے ایک آفاقی تہذیب کے وسیلے کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اس سے اثر اندوز ہونا لازمی تھا مگر یہ اثرات محض تقلیدی نہیں تھے بلکہ فارسی سے اردو نے محض ادبی سانچے لئے ہیں مگر ان سانچوں میں اردو ادیبوں نے ہندوستانی رنگ بھرا ہے جس طرح اردو میں ناول کا لفظ انگریزی سے آیا مگر ہمارے ناول انگریزی کا چربہ نہ تھے بلکہ ہندوستانی زندگی کے عکاس تھے اسی طرح قصیدہ گو عربی لفظ تھا اور فارسی سے ہو کر ہم تک پہنچا مگر قصیدوں میں بھی ہندوستانی زندگی ہی کی عکاسی ہوئی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے جناب صدر اور جملہ حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

• سکریٹری شعبۂ اردو

جہانِ غالب

غالب صدی تقریبات کے دوران چھپوائے گئے لیٹر پیڈ، ہینڈ بلس، تہنیتی فلیٹس، کیلنڈر، پوسٹرس، اسٹیمپس، پوسٹ کارڈ، لفافے، غالبی تصاویر، غالبی اسکیچز، غالبی نمائش کے فوٹوگرافس، غالب کی غزلوں کے ریکارڈ کے کور، غالبی تقریبات کے کور، غالب کلینڈر، ایگل تھرماس کمپنی کا، مرزا غالب فلم کے گانے کی کتاب، غالبی تحفے وغیرہ کو یکجا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

جو حضرات انجمن، ادارے، غالب صدی تقریبات کمیٹی کے رکن، غالب نواز، ادیب و شائقین مندرجہ بالا چیزیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں مہیا فرمائیں تو ان کو REPRODUCE کر کے واپس کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی غالب کے ایک سو ایک اشعار پر مشتمل خوبصورت کتابچہ گوالیار پرابچ کا شائع کردہ عنایت کیا جائے گا۔

اسلام الدین۔ ٹی ٹی نگر بھوپال

ء ۱۳۶۴ - ۵۹/۸-۱۲۱

اظہار تعزیت

انجمن ترقی اردو ضلع اجمیر کی جانب سے بھارت کی دو عظیم المرتبت شخصیتوں جناب پنڈت راج نرائن کنزرو اور جناب خواجہ غلام السیدین کے انتقال پر دلی رنج و الم کے ساتھ اظہار تعزیت کیا جاتا ہے۔ علمی اور ادبی دنیا میں ہر دو اصحاب کے کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

• سید عبدالرؤف صدر انجمن ترقی اردو ضلع اجمیر

ایک رعایتی اعلان

یوم جمہوریہ کے مبارک موقع پر انجمن ترقی اردو نے اپنی مندرجہ ذیل مطبوعات پر چالیس فیصدی کمیشن دینا طے کیا ہے اس رعایت کی مدت ۲۲ جنوری ۱۹۷۳ء سے ۲۹ فروری ۱۹۷۲ء تک مقرر کی گئی ہے۔ تاجران کتب کے علاوہ انفرادی خریدار بھی اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۱۔ الایام	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	۴٫۰۰
۲۔ آئینۂ حقیقت	حبیب الرحمٰن شاستری	۲٫۰۰
۳۔ بھگوت گیتا	محمد اجمل خاں	۲٫۵۰
۴۔ پرچھائیں	آصف علی	۴٫۰۰
۵۔ دخمیہ	منور لکھنوی	۳٫۰۰
۶۔ سیر افلاک	حکیم احمد	۵٫۰۰
۷۔ فن تحریر کی تاریخ	محمد اسحاق صدیقی	۷٫۵۰
۸۔ کاروان حیثیت	نجم الدین شکیب	۲٫۵۰
۹۔ مذہب اور دھرم	مہاتما گاندھی	۴٫۰۰
۱۰۔ مشترکہ زبان	"	۱٫۵۰
۱۱۔ مرقع افغان	ابرار حسین فاروقی	۳٫۲۵
۱۲۔ مدارا گلشمس	منور لکھنوی	۳٫۵۰
۱۳۔ مطالعۂ خنگین	یونس خالدی	۳٫۰۰
۱۴۔ نفسیات اور جنسی انتخاب	محمد عابدی	۴٫۵۰
۱۵۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول	ڈاکٹر ایشور ٹوپا	۲٫۲۵

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

اردو کے نامور ناول نگار عادل رشید کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

دلی : انجمن تعمیر اردو دلی کے زیر اہتمام دلی کے ادبا و شعراء اور اہل قلم کا ایک جلسہ جناب پیرزادہ سید انیس حسن لقمانی کی زیر صدارت اردو کے مایۂ ناز ناول نگار جناب عادل رشید کی تعزیت میں اردو ہال میں منعقد ہوا۔

جناب گلزار دہلوی نے مرحوم کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی وضعداری، منکسر مزاجی، مرنج طبیعت، خوش اخلاقی اور ۱۵۰ ناولوں کی تصنیف کا ذکر کیا اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات بیان کئے۔ پھر صدر جلسہ کی جانب سے ایک تعزیتی تجویز پیش کی گئی اور باتفاق آراء منظور کی گئی جس میں اظہار رنج و ملال کے بعد مرحوم کے اعزا اور اہل وعیال سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔

• نامہ نگار

اردو شعرا کی جانب سے بنگلہ دیش کا خیر مقدم

حیدر آباد۔ ٹریری اینڈ کلچرل گروپ حیدر آباد کی جانب سے بنگلہ دیش کی آزادی اور سال نو کے استقبال کے لئے تعمیر اسکول خیریت آباد میں ایک پراثر محفل شعر منعقد ہوئی جس میں شریک ہونے والے شعراء اور باذوق سامعین نے بنگلہ دیش کی ایک نئی ترقی پسند سوشلسٹ اور سیکولر مملکت کا گہرے جذبات مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ سید محمد حسین سکریٹری نے بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کو وزیر اعظم اندرا گاندھی کا ایک اور عظیم اور تاریخ ساز کارنامہ قرار دیا۔

مشاعرے میں بہت سے ممتاز و نامور شعرائے کرام نے بنگلہ دیش پر اپنی نظمیں اور غزلیں سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔

• قومی آواز لکھنؤ

جنگاؤں میں اردو اساتذہ کی عدم فراہمی

جنگاؤں : جناب محمد محبوب خاں معتمد انجمن ترقی اردو شاخ جنگاؤں نے اپنے ایک بیان میں بتلایا کہ مستقر جنگاؤں جونیر کالج میں اردو میڈیم کی نویں اور دسویں جماعت میں تقریباً ۱۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں لیکن ان طلبہ کے لئے اردو اساتذہ کی عدم فراہمی کے باعث طلبہ کو اردو تعلیم کے حصول میں سخت دشواریاں پیش آرہی ہیں طلبہ کا معیار تعلیم بری طرح متاثر ہو رہا ہے اور ہر سال پیرس ہی کے امتحانات کا نتیجہ مایوس کن برآمد ہوا۔ اردو داں طلبہ اور اولیاء طلبہ میں تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے اس خصوص میں اردو میڈیم کے طلبہ کے مسائل سے محکمہ تعلیمات اور دیگر متعلقہ عہدیداروں کو انجمن ترقی اردو جنگاؤں کی جانب سے وقتاً فوقتاً واقف کرایا گیا۔ اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کی دشواریوں کو دور کرنے کا پرزور مطالبہ کرنے کے باوجود محکمہ تعلیمات کی جانب سے سراسر ناانصافیوں کے باعث ایک تشویشناک صورت پیدا ہو گئی ہے۔

• رہنمائے دکن

اردو جماعتوں کی منظوری

جنگاؤں : جنگاؤں کے دو مدارس نوشہ اور گنڈلہ گڈہ پر مہتمم تعلیمات ورنگل کی جانب سے اردو جماعتوں کے آغاز کرنے کی منظوری دیدی گئی ہے۔ مگر ان مدارس پر اردو اساتذہ فراہم نہ کرنے کے باعث تعلیم کے آغاز میں سخت دشواریاں ہو رہی ہے محکمہ تعلیمات کو مدرسین کی تقرری کا جلد انتظام کرنا چاہئے۔

• رہنمائے دکن

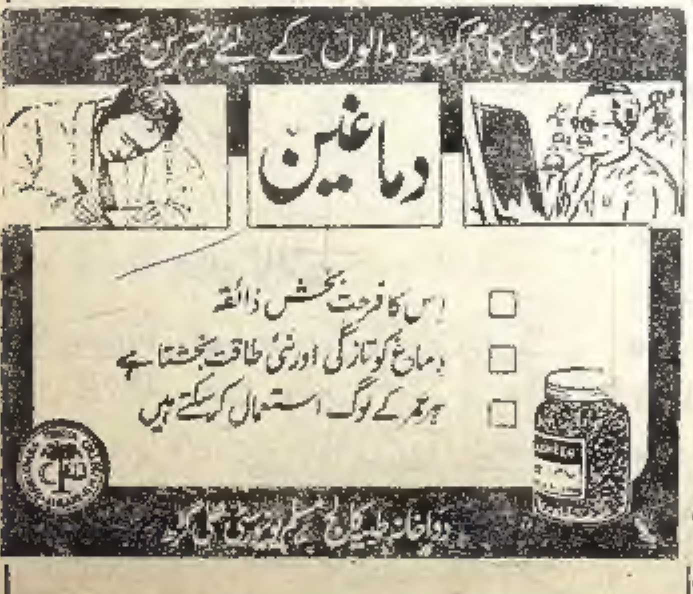
صفحہ ۶ سے آگے

آخر میں ایک بات اور عرض کر دوں۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے یہ مقالہ مولانا آزاد کے فکر و فن پر لکھا ہے نہ کہ ان کے سوانح حیات پر۔ اگر اس سلسلے میں "ابوالکلام آزاد — فکر و فن" کا مقدمہ ہی پڑھ لیا جاتا تو مصنف کے دائرۂ کار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا اور بہت سے اعتراضات کا سدباب ہو جاتا۔

گذارش

"ہماری زبان" کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ ملحوظ رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں

(ادارہ)



آندھرا میں اردو کے مسائل

حیدرآباد: نئی ریاستی حکومت کی جانب سے تلگو کو سرکاری زبان اور جامعاتی سطح پر ذریعہ تعلیم بنانے کے اقدامات کے باوجود اردو میں اعلیٰ تعلیم کی اپنی ہی ضرورت کی تکمیل پر کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے جس کے نتیجہ میں اردو والوں میں تشویش اور بے چینی ہر جگہ محسوس کی جا سکتی ہے۔ آندھرا پردیش میں اردو جونیر کالجس کے قیام کے باوجود سرکاری زیر انتظام اردو ڈگری کالجس کے قیام سے احتراز کی موجودہ پالیسی حقیقت پسندانہ نہیں۔ چیف منسٹر جناب پی وی نرسمہا راؤ نے اس سلسلہ میں اردو بولنے والوں اور ان کے نمائندوں کے مطالبات اور توجہ دہانی کے باوجود کوئی ٹھوس پالیسی بیان ابھی تک نہیں دیا ہے۔ آئندہ عام انتخابات سے پہلے حکومت اور کانگریس کو چاہئے کہ وہ اردو سے متعلق اپنی پالیسی سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کے ازالہ کی کوشش کرے اور تمام امور کی یکسوئی کو ممکن بنانے کے لئے اردو نمائندوں کا ایک مشاورتی اجتماع طلب کیا جائے۔ اردو بولنے والوں کے اس مطالبے کے بارے میں ریاستی کانگریس اور حکومت کو توجہ دینی ہوگی کہ سرکاری اور جامعہ عثمانیہ کے زیر انتظام کالجس میں اردو کی ڈگری تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے۔ خانگی شعبہ کے رحم و کرم پر اردو کی ڈگری تعلیم کو چھوڑ دینے کا کوئی منصفانہ یا جمہوری جواز نہیں ہو سکتا۔ کانگریسی مسلمانوں کو بھی اردو سے متعلق حکومت کی اس پُرانتشار پالیسی کے جائزہ لینے اور بے باکانہ ترجمانی ادا کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔ تحلیل شدہ تلنگانہ پرجا سمیتی کے قائدین تو اقلیتوں کو یہ تیقن دیتے رہے ہیں کہ تلنگانہ میں اردو دوسری سرکاری زبان ہوگی لیکن اب کانگریس میں واپسی کے بعد یہی قائدین بالکل خاموش ہو گئے ہیں۔ پرجا سمیتی کے ان سابق رہنماؤں کو اپنے ان وعدوں اور یقینات کی تکمیل کا ایک اچھا موقع ریاستی حکومت میں شمولیت کے ذریعہ حاصل ہوا ہے اس لئے انتخابات سے قبل ہی اس خصوص میں انھیں اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جانا چاہئے۔

• رہنمائے دکن

یونیورسٹی سطح پر تلگو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں احتیاط کی ضرورت

حیدرآباد: وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلی بار ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے جناب نرود ریڈی نے کہا کہ یونیورسٹی ڈگری سطح پر تلگو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی غرض سے ایسے اقدامات کرے گی جن کے ذریعہ تبدیلی بہ آسانی دستیاب ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ ذریعہ تعلیم کے بارے میں نہایت ہی احتیاط برتنا چاہئے۔ عاجلانہ طور پر کوئی فیصلہ خطرناک ردعمل کا سبب بن سکتا ہے۔

• سیاست حیدرآباد

غالب و عارف شیروانی

نسخۂ عرشی میں غالب کی نو شعر کی ایک نامکمل غزل ہے مطلع اور اس کے بعد چار شعر مکمل ہیں مگر بقیہ چار شعروں کے صرف دوسرے مصرعے درج ہیں۔ جناب عارف نے نہ صرف غالب کے ان چار شعروں پر مصرعے لگائے ہیں بلکہ آخر میں چار شعروں کا اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ یہ کوشش دلچسپ ہے اور اس لئے ہماری زبان میں اسے شائع کیا جاتا ہے۔

(ادارہ ہماری زبان)

غالب

نشوٌ سوزشِ دل درخورِ عناب نہیں
سرِ سودازدہ آتشکدۂ تاب نہیں

ہمت وحوصلۂ شورشِ شبنم معلوم
قلزمِ اشکِ نم دیدۂ خونناب نہیں

ہمت و شوقِ طلبگاری مقصود کہاں
برقِ خرمنِ زنِ بیتابیٔ سیماب نہیں

پرسشِ عشق سے ہے ان کو فراغت مقصود
ہدیۂ پارۂ دل نازشِ جلباب نہیں

گلشنِ ہستیِ عالم ہے دبستان نشاط
نقشِ گل رونقِ بے مشقیِ طلاب نہیں

عارف	غالب
دلِ افسردہ نہیں رونقِ بزمِ خوباں	شمع بے زیب دہِ مجلسِ احباب نہیں
غمِ دوراں غمِ انساں غمِ جاناں غمِ دل	غم ہی اک چیز ہے دنیا میں جو کمیاب نہیں
پرتوِ غم سے ہے پرنورِ جہانِ دلِ زار	شبِ تاریکِ خیالِ دل مہتاب نہیں
دلِ بیتاب جو لرزش سے دھڑکتا تو ہوا	تارِ تمکین حریفِ سرِ مضراب نہیں

عارف

اب تصور میں مرے قائم و دستیاب نہیں
رشکِ فردوس یہ اب وادیٔ شاداب نہیں

تھا سر اک قطرۂ خوں محرمِ اسرارِ جہاں
نوکِ مژگاں پہ مرے وہ دُرِ نایاب نہیں

موسمِ گل ہے مگر فیضِ بہاراں کی قسم
اک مرا نخل تمنا ہے کہ شاداب نہیں

تشنۂ مہر و کرم کون ہے تیرا اے دوست
ہاں مگر اک دلِ عارف ہے کہ سیراب نہیں

خواجہ میر درد
تصوف اور شاعری
از
ڈاکٹر وحید اختر
انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ)

پروفیسر مسعود حسین خاں

میرا صفحہ

بنگلہ دیش اور اردو

بنگلہ دیش اب ایک سیاسی حقیقت بن چکا ہے۔ اس نئی سیاسی حقیقت کے ظہور کے بعد دور رس معاشی، معاشرتی اور لسانی تبدیلیاں کا واقع ہونا ناگزیر امر ہے۔ اس سرسبز سرزمین میں اردو اور اردو والے کئی سیاسی انقلابات سے گزر کر اب تاریخ کے سیل کی زد پر آچکے ہیں۔ ہر چند قدیم زمانے سے بنگلہ دیش، بنگالی زبان کا مرزبوم رہا ہے لیکن اس کی تاریخ کے تار پود میں بنگالی کے علاوہ ایک دوسری ہندوستانی زبان، اردو بھی رہی ہے۔ غیر منقسم بنگال میں کلکتہ اور مرشد آباد کے بعد ڈھاکہ ہی اردو کا بڑا مرکز رہا ہے۔ قدیم زمانے سے وہاں ایسے خاندان اور محلے آباد ہیں جو اردو بولتے اور پڑھتے آئے ہیں۔ بنگالیوں کی اسلامی زبانوں، بالخصوص عربی سے دلچسپی، اردو کی مزید تقویت کا باعث بنی رہی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں بنگالی کے لئے عربی فارسی رسم خط کو استعمال کرنے کی تحریک بھی ملتی ہے۔ مشرقی بنگال کی بنگالی میں عربی فارسی الفاظ کی کثرت سے اس کے اور اردو کے مابین ایک مزید رشتہ استوار رہا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل مشرقی یوپی اور بہار کے بے شمار اردو بولنے والے خاندان روزگار کی تلاش میں یہاں آتے اور بستے رہے ہیں۔ انھوں نے کم و بیش اپنی لسانی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ انھیں کی وجہ سے تقسیم ہند سے قبل ڈھاکے کے کئی اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھنے پڑھانے کی سہولتیں اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی، فارسی کے ساتھ اردو کی تدریس کا انتظام رہا ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد مشرقی یوپی اور بہار کی اردو بولنے والی آبادی بڑے پیمانے پر منتقل ہو کر یہاں آگئی اور مغربی پاکستان کے سرکاری ملازمین کا، جن کی تعلیمی و تہذیبی زبان اردو ہی تھی، یہاں بڑا اجتماع ہو گیا۔ ڈھاکے میں ہر طرف اردو کا چرچا ہو گیا اور بے شمار اردو میڈیم کے اسکول کھل گئے۔

اردو بولنے والوں کے خلاف علاقائی تعصب تقسیم ہند سے پہلے بھی موجود تھا، اور انھیں "بہاری" کی عام اصطلاح سے یاد کیا جاتا رہا ہے لیکن اس کی بنیاد خالص معاشی تھی۔ اردو کی جانب معاندانہ اور باغیانہ رویہ کی ابتدا ۱۹۴۸ء میں قائد اعظم کے اعلان سے ہوتی ہے جس کے بعد اردو کو باقاعدہ طور پر پاکستان کی واحد سرکاری زبان کی حیثیت سے مسلط کرنے کی کوشش کی گئی۔ بنگلہ دیش میں علاحدگی پسندی کی تحریک کا سب سے بڑا محرک پاکستانی حکومت کی یہی جانبدارانہ لسانی پالیسی تھی۔ اس کی ذمہ داری پاکستان کے بابائے قوم اور بابائے اردو دونوں کے سر جاتی ہے۔ اس کو شرقی بنگلہ دیش کے ان "بہاری" عناصر سے جن کے احساس برتری نے ایک آمرانہ لسانی تسلط کی شکل اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ بنگالی، جو عربی کے ساتھ اردو کو بھی اپنے لئے اسلامی تہذیب کا باب داخلہ سمجھتے تھے اور اس میں شُدبُد رکھنا اپنے لئے باعث افتخار، جب ان کی مادری زبان بنگالی پر زد پڑی اور ان کے لئے رابندرناتھ ٹیگور تک کے سرمدی نغموں کے دروازے بند کئے جانے لگے تو وہ پوری انقلابی شدت کے ساتھ بھڑک اٹھے اور بالآخر ایک دہے کی کشمکش کے بعد ڈھاکہ کے "شہید مینار" کی قیمت پر انھوں نے بنگالی کو اردو کے ہم پایہ کرکے چھوڑا۔

خیال تھا کہ اس کے بعد لسانی توازن قائم ہو جائے گا۔ وہ تو ہو گیا لیکن سیاسی توازن روز بروز بگڑتا گیا۔ اس کے بعد کے واقعات ناظرین کے لئے "تاریخ نہیں مشاہدہ ہیں۔

اب جب کہ بنگلہ دیش سیاسی حقیقت بن چکا ہے اور وہاں کی حکومت نے بنگالی کو نئی مملکت کی واحد سرکاری زبان بنانے کا اعلان کر دیا ہے، اردو پر کیا گزرے گی، کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت وہاں ایک اندازے کے مطابق ۱۵ تا ۲۰ لاکھ اردو بولنے والے موجود ہیں۔ ان کے خلاف تعصب و انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ بنگلہ دیش کے نئے سماج میں ان کا کیا مقام ہوگا اور کس طرح ان کی آبادکاری ہوگی، یہ سب ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں ابھی کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ایک ایسے اردو بولنے والے کی حیثیت سے جسے بنگلہ دیش میں چار سال تک رہنے اور وہاں کے رہنے والوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ بنگلہ دیش کے رہنے والوں کو اردو بولنے والوں سے جس قدر بھی شکایت ہو، اردو سے عربی، فارسی کی طرح انھیں لگاؤ ہے اور رہے گا۔ اس لئے کہ ان زبانوں کی تحصیل ان کی تہذیبی انفرادیت اور تاریخی شخصیت کے لئے ضروری ہے۔ قوموں کی تقدیریں ان کی تاریخ سے بنتی ہیں اور بنگلہ دیش کی نئی قومیت کے سرچشمے ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ بنگلہ دیش اپنی تاریخ کے اس دور بسیط کا منکر نہیں ہو سکتا اور نہ اس عہد کے ان لسانی اثرات کا جس کی سب سے رنگین کشیدہ کاری کا نمونہ اردو زبان ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپا اور مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا